بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

طوفان خواہ کتنے ہی تباہ کن ہوں ان کی ابتدا چند ہلکے پھلکے جھونکوں سے ہوتی ہے اور چند تنکوں سے اُن کے رُخ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہی حال کسی ملک میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی طوفانوں کا ہوتا ہے۔ اُن کی ابتدا بھی چند چھوٹے چھوٹے واقعات بلکہ حادثات سے ہوتی ہے اور عوام کے ذہنوں میں اُن کی وجہ سے جو ارتعاش پیدا ہوتا ہے اس سے اُن کے مزاج اور نوعیت کا بڑی آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے اس ملک کی سیاسی فضا میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ ایسے بگولے اُٹھ رہے ہیں بلکہ اٹھائے جا رہے ہیں جو کسی خوفناک طوفان کا پتہ دیتے ہیں۔ قتل و غارت کے اِکّا دُکّا واقعات بھی اگرچہ کسی مُہذّب معاشرے کی اخلاقی صحت کی بربادی کی علامت ہوتے ہیں لیکن جب قتل و غارت معاشرتی زندگی کا معمول بن جائے بلکہ سیاسی وجوہ کی بنا پر شرفا قتل ہونے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ ملک اب طوفان کی عین زد میں ہے۔

جماعتِ اسلامی کے معروف رہنما اور انتہائی بے لوث خادمِ خلق انسان جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا قتل کسی ایک فرد کا قتل نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا قتل، انسانی ہمدردی اور دلسوزی کا خون اور حق گوئی بیباکی پر کمینہ وار اور باطل کے مقابلے میں استقامت و عزیمت کی درخشندہ روایت پر شرمناک حملہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مقدس خون سے ظالموں نے اس لیے ہاتھ نہیں رنگے کہ اُن سے اُن کو کوئی ذاتی پُرخاش تھی یا اللہ کے اس پاکباز بندے نے اُن کی جائداد پر یا دولت پر قبضہ کر رکھا تھا بلکہ یہ درندہ صفت انسان صرف اس لیے اس مردِ حق آگاہ کی زندگی کا چراغ گل کرنے کے درپے تھے کہ وہ لوگوں کو یہ کہتا تھا کہ "جھوٹے خداؤں کی بندگی کو چھوڑ کر معبودِ حقیقی کی بندگی اختیار کرو۔" اِس ایک

"جُرم" کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا جُرم نہ تھا اور اسی جُرم کی پاداش میں اس ملک کے ہر آمر نے اس کی زبان بندی کے لیے کئی جتن کیے، مختلف طریقوں سے اُسے ستایا۔ اس کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کیں۔ حتیٰ کہ اُسے ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد مرتبہ قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ اپنے اس "جُرم" سے باز آجائے، لیکن حق کے اس مسافر نے ان مصائب و شدائد کو پرِ کاہ کے برابر بھی نہ سمجھا اور حق و صداقت کی راہ پر بڑی پامردی سے گامزن رہا۔ یہاں تک کہ دشمن کے لیے اس ملک میں اس کا وجود ناقابلِ برداشت ہو گیا اور اس نے اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ حق پرست جسے نہ تو ظلم و استبداد ڈرا سکتا ہے نہ کسی دنیوی مفاد کا لالچ اسے خرید سکتا ہے، اُسے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دینے کی ایک ہی صورت ہے کہ اُسے گولی سے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوا اور اسلام کا یہ بطلِ جلیل خدا کے دین کا علم بلند کرتا ہوا شہید کر دیا گیا۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑی سعادت اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر اپنی جان آفرین کے حوالے کر دے اور خداوند تعالیٰ کے حضور میں اپنے خون کا نذرانہ پیش کرتے ہوئے ادب و انکسار سے کہے ؎

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ڈاکٹر صاحب مرحوم دین و دنیا دونوں میں فائز المرام ہیں۔ وہ بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہوں نے اپنا گوہرِ مقصود پا لیا ہے۔ البتہ جن لوگوں کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں اُن کے لیے یہ صدمۂ جانکاہ ہے۔ اُن کی وفات سے اُن کے بیوی بچوں پر جو افتاد پڑی ہے وہ بڑی المناک ہے۔ اُن کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دل جس طرح اُن کی جدائی سے زخمی ہوئے ہیں اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ زخموں کی اس ٹیس کو وہ خود ہی محسوس کرتے ہیں اور قحط الرجال کے اِس دور میں جماعت اسلامی اپنے ایک بہترین کارکن کی خدمات سے جس طرح محروم ہوئی ہے اُس کا اندازہ اُن درد بھرے الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے جو امیرِ جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ان کی شہادت پر ارشاد فرمائے۔ یہ صدمات، نقصانات اور محرومیاں اپنی جگہ بڑی ہی تکلیف دہ ہیں اور ان کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی الّا یہ کہ قادرِ مطلق غائب سے

کوئی سامان کر دے، لیکن ان سب سے بڑھ کر تکلیف دہ بلکہ تشویشناک چیز جس کی طرف مولانا نے اشارہ کیا ہے وہ ملک کا انتہائی مخدوش مستقبل ہے۔ وہ کوتاہ بیں لوگ جنہوں نے یہ سنگین جرم اس زعمِ باطل میں گرفتار ہو کر کیا ہے کہ اگر انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو خون کی رنگین چادر میں ایک مرتبہ ڈھانپ کر عوام کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے تو پھر وہ ہمیشہ کے لیے اس "خطرے" سے محفوظ ہو جائیں گے انہیں جلد ہی اپنی کوتاہ نظری کا احساس ہو جائے گا۔ ان سے پہلے بھی عقل کے اندھوں نے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اپنی نظر میں "ناپسندیدہ عناصر" کو خون کی چادر میں لپیٹ کر اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن انہیں جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ اُن کا یہ ظالمانہ حربہ نتائج کے اعتبار سے سخت ناکام ہے اور اس نے اُن کے لیے نہایت سنگین مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ خونِ ناحق کے ہر قطرے سے لاتعداد "ناپسندیدہ عناصر" نے جنم لیا اور جن کے ہاتھ سے اپنے تخت و تاج کو محفوظ کرنے کے لیے اُن عاقبت نا اندیشوں نے خون کی ہولی کھیلی تھی وہی ہاتھ بالآخر ان کی بربادی کا سبب بنے۔

شرک کے بعد قتلِ ناحق سے زیادہ خدا کے نزدیک کوئی دوسرا جرم نہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (الفرقان - ۶۸)

وہ لوگ جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ط وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ط (المائدہ - ۳۲)

جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کو زندگی بخشی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا اس بات پر منحصر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان و مال کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا اور تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ صادق رکھتا ہو۔ جو شخص یا گروہ ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ انسانیت کے اس شیریں عنصر سے محروم

ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے انسانوں کی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے۔ وہ صرف ایک فرد یا چند افراد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیٔ نوع کے جذبے سے یکسر خالی ہے۔ لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے۔ ایسے دشمن انسانیت سے زیادہ رذیل شخص کون ہو سکتا ہے؟ اور اس کے خبثِ باطن سے یہ بات کس طرح بعید ہے کہ اگر اُسے پوری نوعِ بشری کو قتل کرنے کا موقع میسر آئے تو وہ اس سے پرہیز کرے گا۔

محولہ بالا آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے کہ جب ایک مرتبہ کسی شخص یا گروہ کے مُنہ کو انسانی خون کی چاٹ لگ جاتے تو پھر کسی انسان کی جان محفوظ نہیں رہتی۔ ایسا شخص یا گروہ ایک جان لینے کے بعد مطمئن نہیں ہوتا بلکہ دوسری جانوں کے درپے ہوتا ہے۔ یہاں تک پوری انسانیت کا لہو چاٹ لینے کے بعد وہ سیر نہیں ہونے پاتا بلکہ ہل من مزید کی دہائی دیتا ہوا اور انسانوں کی تلاش کرتا ہے تاکہ اُن کے خون سے تسکین حاصل کرے۔

یوں تو ہر جرم کسی معاشرے کی اخلاقی بربادی کا موجب بنتا ہے اور جو شخص سب سے پہلے اس کا ارتکاب کرتا ہے اس کی گردن پر اُن مجرموں کے بوجھ کا بھی ایک حصّہ لاد دیا جاتا ہے جو بعد میں اس کی شہ پاکر ظلم و تعدّی کا یہ راستہ اختیار کرتے ہیں لیکن حدیث میں خاص طور پر قتل کے بارے میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ رُوئے زمین پر جو بھی قتلِ ناحق ہوتا ہے اُس کے وبال کا ایک حصّہ قابیل کے نامۂ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ اس جور و ستم کا بانی تو وہی تھا۔

حضور سرورِ دو عالمؐ نے اپنے مخصوص انداز میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:

لا تُقتل نفسٌ ظلماً اِلّا کان علی ابن آدم الاول کفلٌ من دمھا لانہ کان اوّل من سنّ القتل۔

جب ظلم (ناحق) سے کوئی خون ہوتا ہے تو آدمؑ کے پہلے بیٹے (قابیل) پر اس کے خون (ناحق) کا بوجھ پڑتا ہے کیونکہ اس نے سب سے پہلے قتل کی راہ نکالی۔

وہ ماہرینِ نفسیات جنہوں نے جرائم اور ان کے محرکات اور انسانی زندگی پر اُن کے اثرات کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہیں کہ کسی انسان کے لیے سب سے بڑا جرم اور اس بنا پر اُس کی طبیعت کے لیے سب سے مشکل کام قتلِ انسانی ہے۔ چنانچہ قاتل جب تک جوہرِ انسانیت

کو یکسر تیاگ کر ظالم درندہ نہیں بن جاتا وہ اس جُرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔ انسانی فطرت کا خمیر تعمیری رُجحانات سے اٹھایا گیا ہے، تخریبی سے نہیں اس لیے وہ جب تک نفس کی ساری خباثتوں اور غلاظتوں سے اپنے دل کو ڈھانپ نہیں لیتا وہ اس وقت تک انسانی زندگی پر ہاتھ ڈالنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ اس جُرم میں خوف کا عنصر بھی غیر معمولی طور پر شامل ہوتا ہے کیونکہ کسی دوسرے فرد کی جان پر حملہ درحقیقت اُس کی اپنی جان کے خلاف ایک خوفناک سازش ہوتی ہے مگر ایک مرتبہ وہ جب کسی انسان کے خُون سے ہاتھ رنگ لیتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے خوف میں کمی آنا شروع ہو جاتی ہے اور آخر کار انسانی جان کا زیاں اس کے نزدیک کھیل تماشے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

کسی فرد یا چند افراد کا عام حالات میں قتل اگر اتنے سنگین نتائج پیدا کر سکتا ہے تو اس قتل کی تباہ کاریوں کا اندازہ کیجیے جس کا ارتکاب سیاسی اختلافات کی وجہ سے کیا جاتا ہے۔ حکومت کے انتظام و انصرام کے طریق کار کو عرفِ عام میں سیاست کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں حتمیت اور قطعیت کی توقع نہیں کی جا سکتی جو عام طور پر سائنسی علوم یا مذہبی معتقدات میں پائی جاتی ہے۔ سیاسی امور میں اختلاف رائے کا ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا کہ کسی ذی روح میں سانس کی گردش۔ اس بنا پر دنیا کا ہر صحتمند معاشرہ سیاسی میدان میں اختلافات کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے اور اُسے اجتماعی ترقی کی سب سے نمایاں علامت سمجھتا ہے۔ البتہ وہ اس بات کا ضرور خیال رکھتا ہے کہ سیاسی اختلاف کی آڑ میں ملک و ملت کی تباہی کا سامان نہ کیا جائے۔ اس خطرے کے تدارک کے لیے ایک لگا بندھا طریق یہ وضع کیا گیا ہے کہ ہر معاشرہ پہلی منزل پر یہ طے کر لیتا ہے کہ اُسے کن اساسی تصورات کے علمبردار کی حیثیت سے دنیا میں زندہ رہنا ہے اور کن مقاصد کی تکمیل کے لیے سرگرم عمل ہونا ہے۔ یہ اساسی تصورات اس معاشرے کی تشکیل میں بنیاد کا کام بھی دیتے ہیں اور اُس کی زندگی کے مختلف خانوں میں مخصوص رنگ بھر کر اُسے دُوسرے معاشروں سے ممیز و ممتاز بھی کرتے ہیں، پھر ان امتیازات سے اُس کی نظریاتی سرحدیں تعمیر پاتی ہیں۔ مقاصد کا تعیّن اس کی جدوجہد کا رُخ متعین کرتا ہے جس سے اس کے اندر اخلاقی احساسات اُبھرتے ہیں۔ جو قومیں عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا عزم رکھتی ہیں وہ دوسرے

نقصانات تو برداشت کر لیتی ہیں مگر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتیں کہ اُن کی زندگی کی اساس، ان کی نظریاتی سرحدوں اور اُن کے نصب العین کو کسی طرح گزند پہنچے۔ وہ ان کا پوری قوت سے تحفظ کرتی ہیں اور جو لوگ ان کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ خواہ وہ باہر کے دشمن ہوں یا گھر کے تخریب کار، وہ ان کا سختی سے محاسبہ کرتی ہیں۔ دنیائے مغرب میں ریاست اور حکومت کے مابین جو لطیف سا فرق پایا جاتا ہے وہ اجتماعی زندگی کی اساس اور نظریاتی سرحدوں کے بارے میں اہلِ مغرب کے غیر معمولی احساس کا نتیجہ ہے۔ ان دائروں میں ان کا احساس اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ انہوں نے ریاست کے اندر الوہیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ ریاست کو ایک محسوس اجتماعی ڈھانچے سے اٹھا کر مجرد نظامِ فکر کی سطح پر لے جانا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مغرب کے سیاستدان ریاست کو اپنی قومی زندگی کے اساسی تصورات کا ہیولا سمجھتے ہیں اور ان اساسی تصورات کے تقدس کی وجہ سے انہوں نے ریاست کے اندر شانِ کبریائی پیدا کی ہے۔ وہ اگر ریاست اور حکومت کے مابین یہ تفریق نہ کرتے اور اپنے اساسی نظریات کو اسی مقام پر رکھتے جس مقام پر کہ انہوں نے حکومت کو رکھا ہے تو اُن کا اجتماعی ڈھانچہ کبھی کا منتشر ہو چکا ہوتا۔

اسلام میں چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کوئی دوسری ذات صفتِ الوہیت سے متصف تصور نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کبھی بھی ریاست کو اہلِ مغرب کی طرح کبریائی کے مقام پر فائز نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں سیاست کے بارے میں جو ادب ملتا ہے اس میں ریاست اور حکومت کے درمیان وہ واضح فرق محسوس نہیں ہوتا جو مغربی سیاست میں پایا جاتا ہے۔ ریاست اور حکومت کو ہم معنی سمجھنے کے باوجود اگر مسلمانوں کے نظمِ اجتماعی کو اُن کے دورِ عروج میں کوئی نقصان نہیں پہنچا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اساسی تصورات اور معتقدات سے کبھی انحراف نہیں برتا۔ ان کے سامنے یہ حقیقت برابر موجود رہی کہ ان کی بقا کا سارا دارومدار اُن تصورات اور معتقدات کے تحفظ اور اُن کے ساتھ غیر معمولی وابستگی پر ہے اس لیے انہوں نے ان پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دی اور اُن کی حفاظت اور پاسبانی کا فرض بڑی دلسوزی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کیا جیسا کہ مغربی نیشنلزم کے پرستار آج کل کی الوہیت کی حامل ریاستوں کا کرتے ہیں۔

مگر حکومت کے بارے میں فاشسٹ ریاستوں کے علاوہ کسی نے بھی غیر مشروط اطاعت کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ ملکی نظام و انصرام میں اختلافِ رائے کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے اور اسے ہر عادل حکمران نے بڑی خوشدلی کے ساتھ برداشت کیا ہے بلکہ اگر اس نے کبھی یہ محسوس کیا کہ عوام اپنی رائے کو بے کم و کاست بیان کرنے میں تامل کر رہے ہیں تو اُسے اس کی فکر لاحق ہوتی اور جب تک اس رجحان میں نمایاں تبدیلی نہ ہوئی اس وقت تک وہ اصلاحِ حال میں پیہم مصروف رہا۔ حکومت کا فرض اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کے علاوہ اُن تخیلات کو بروئے کار لانے کی کوشش کرے جو اُس کے شہریوں نے اجتماعی زندگی کی اساس کے طور پر قبول کر رکھے ہیں۔ حکومت کا زیادہ تر تعلق عملی مسائل اور دشواریوں سے ہوتا ہے اور اس میں اختلاف رائے کا اُبھرنا بالکل طبعی امر ہے۔ اگر اساسی نظریات کے دائرے میں اختلاف کسی قوم کو انتشار میں مبتلا کرتا ہے تو امورِ مملکت میں اختلاف کو دبانے سے آمریت کی راہ ہموار ہوتی ہے

بدقسمتی سے پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اجتماعی صورتِ حال سب سے مختلف اور سب سے نرالی ہے۔ حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں اجتماعی زندگی کی اساس کے تحفظ کا پورا پورا انتظام موجود تھا اور اس کے کسی گوشے میں معمولی سا نقصان بھی گوارا نہ کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس جوش اور ولولے اور جس دینی حمیت کے ساتھ مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کسی اسلامی شعار کا دینی اساس کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہوتا ہے اور ایک مسلمان حکمران پر اس معاملے میں کس قدر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن جہاں تک امورِ مملکت کو چلانے کا تعلق ہے اس میں ہر قسم کے اختلافات بخوشی برداشت کیے جاتے تھے بلکہ خلفائے راشدین اسلامی مملکت کے شہریوں کو احتساب کے معاملے میں اُن کی ذمہ داریوں کا ہمیشہ احساس دلاتے اور جب کبھی وہ اُن کے اس احساس میں اضمحلال پاتے تو متفکر ہو جاتے۔

خلفائے راشدین کے بابرکت دور کے بعد جب ملوکیت کا دور شروع ہوا تو اگرچہ سیاسی حالات

(باقی صفحہ ۴ پر)

(بقیہ) اشارات

میں بعض نمایاں تبدیلیاں معرضِ وجود میں آئیں مگر قریب قریب سارے حکمرانوں نے مسلم معاشرے کے اجتماعی تصورات کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ آنے دی اور اس کی نظریاتی سرحدوں کی پوری جرأت کے ساتھ پاسبانی کی اور کسی دشمنِ دین کو ان پر حملہ آور ہونے کا موقع نہ دیا۔ جہاں تک امورِ مملکت میں اختلاف رائے کا تعلق ہے۔ اس معاملے میں البتہ بعض حکمرانوں نے اس فراخدلی کا ثبوت نہ دیا جس کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مسلم سلاطین کی عظیم اکثریت تنقید کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرتی رہی اور بہت کم ایسے مواقع آئے جن پر محض اختلاف رائے کی وجہ سے کسی شخص کو جان کے لالے پڑے ہوں۔

اسلامی ریاست کے دائرے سے باہر نکل کر جب ہم دورِ جدید کی غیر مسلم ریاستوں پر غور کرتے ہیں تو اُن میں نظریات کے وسیع اختلاف کے باوجود ایک چیز قدرِ مشترک کے طور پر پاتے ہیں کہ یہ تمام ریاستیں اپنے اساسی تصورات کی پوری طرح محافظت کرتی ہیں۔ انگلستان اور فرانس کے اندر اختلاف رائے کی جس قدر آزادی ہے اُسے پوری دنیا جانتی ہے لیکن وہاں کی بسنے والی قوموں نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی ان ریاستوں کی نظریاتی اساس کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے۔ نظریاتی اساس تو خیر بڑی بات ہے، خود ان ریاستوں کے مفاد کے خلاف کسی فرد یا گروہ کو کوئی اقدام نہیں کرنے دیا جاتا اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے مگر جہاں تک امورِ مملکت کا تعلق ہے ان میں اختلاف کی پوری گنجائش ہوتی ہے اور کسی فرد یا گروہ کو محض رائے کے اختلاف کی وجہ سے گردن زدنی نہیں سمجھا جاتا۔

اشتراکی ریاستیں بھی اساسی تصورات کے تحفظ کو اولیت کا درجہ دیتی ہیں کیونکہ اگر ان کا تحفظ نہ کیا جائے تو اس جابرانہ نظام کا وجود ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ انہیں ہر وقت اس بات کا کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر انہوں نے اس معاملے میں ذرا سا تغافل برتا تو یہ غیر فطری نظام فوراً درہم برہم ہو جائے گا

اس لیے اشتراکیت کے علمبردار ریاست کی نظریاتی بنیاد کے استحکام کے لیے فکرمند رہتے ہیں اور اس معاملے میں کسی فرد یا گروہ کی معمولی سی جسارت برداشت نہیں کرتے۔ چونکہ اس مزاج کا نظام انسانی فطرت سے مغائرت رکھتا ہے اس لیے جہاں جہاں یہ نظام قائم ہے وہاں عوام کو رائے کی قطعاً آزادی حاصل نہیں ہوتی اور وہ حکومت کی پالیسی پر کوئی تنقید نہیں کر سکتے۔ حکمران ہمیشہ اس خوف سے لرزاں رہتے ہیں کہ اگر عوام کی زبانوں پر سے پہرے اٹھا دیئے گئے اور انہیں لب کشائی کی جرأت ہوئی تو ان کے گھٹے ہوئے جذبات اس شدت کے ساتھ لاوا بن کر باہر نکلیں گے کہ اشتراکیت کا پورا ڈھانچہ پیوندِ خاک ہو جائے گا۔ انسان یوں بھی جذبات کی گھٹن کو دیر تک برداشت نہیں کر سکتا لیکن خصوصاً ایسی گھٹن جو اس کے اندر اپنی فطرت سے بغاوت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہو اسے اگر ایک مرتبہ اظہار کا راستہ مل جائے تو اس سے خوفناک قسم کے زلزلے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے اشتراکیت اپنے مزاج کی وجہ سے امورِ مملکت کو چلانے کے لیے فسطائی ہتھکنڈوں کو اپنانے پر اپنے آپ کو مجبور پاتی ہے۔

پاکستان، بہت سے مسلم ممالک اور دورِ جدید کے بعض غیر ترقی یافتہ ممالک میں صورت حال مندرجہ بالا سب صورتوں سے یکسر مختلف نظر آتی ہے۔ بعض لوگ یہ کہہ کر اس کی سنگینی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ چونکہ یہ سارے ممالک تجرباتی مراحل سے گزر رہے ہیں، اس لیے ان کے اندر نظریاتی اساس کی اہمیت کا واضح شعور پیدا نہیں ہو سکا۔ مگر یہ حالات کا نہایت ہی سطحی مطالعہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی نظریاتی اساس اس کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو ایک درخت کی جڑ کے لیے ہوتی ہے۔ اگر جڑ مضبوط ہو تو درخت کا تنا اور شاخیں بھی مضبوط ہوتی ہیں اور وہ طوفانوں کا پوری قوت سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن اگر جڑ کمزور ہو تو اسی تناسب سے درخت کا پورا وجود کمزور ہوتا ہے اور طوفان تو کیا ہواؤں کے معمولی تھپیڑے اسے اکھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس لیے جو قوم بھی سنجیدگی کے ساتھ تعمیرِ نو کا عزم لیکر اٹھتی ہے وہ فروعات میں الجھنے کے بجائے سب سے زیادہ توجہ اپنی نظریاتی اساس کو مضبوط بنانے کی طرف دیتی ہے۔ کیونکہ اسی پر اس کی اجتماعی زندگی کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اس نظریاتی اساس کی بدولت اس قوم کے اندر فکر و احساس کی ہم آہنگی اور

اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں تو اختلاف گوارا کر لیتی ہے لیکن اس اساس کے معاملے میں کوئی اختلاف برداشت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے حفظ و بقا ہی میں اس کی زندگی کی ترقی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی زندگی کا نقشہ اس کے برعکس کوئی دوسری صورت پیش کرے تو یہ اس قوم کے لیے بیحد تشویشناک ہوتا ہے۔

دوسرے ممالک کو تو فی الحال جانے دیجیے۔ صرف پاکستان کے حالات کا جائزہ لیکر دیکھیے کہ کیا ہماری نظریاتی اساس کے بارے ہمارا طرزِ عمل تعمیری ہے؟ ہم یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم دنیا کی اُن بدنصیب قوموں میں سے ایک ایسی بدنصیب قوم ہیں جسے نظریاتی اساس کے تحفظ کی قطعاً کوئی فکر دامنگیر نہیں بلکہ ہم خود اپنے ہاتھوں سے اسے مسمار کرنے کے درپے ہیں۔ ہماری اس تخریب پسندانہ روش کے نتائج بھی کھل کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ ہمارے ہاں فکری انتشار کا ایک خوفناک طوفان اُمڈتا آ رہا ہے۔ جس سے ہماری اقدارِ حیات اور ہماری روایات کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ہمارے وہ امتیازی اوصاف جن کی بنیاد پر ہم چند برس پہلے پوری دنیا سے اپنا الگ قومی وجود تسلیم کروانے میں کامیاب ہوئے تھے وہ بڑی سرعت کے ساتھ مٹتے جا رہے ہیں۔ ہمیں زندگی کے ہر میدان میں ناکامیوں اور محرومیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہماری حیثیت اس بے لنگر جہاز کی سی ہو گئی ہے جسے بین الاقوامی دباؤ لہروں کی طرح جس طرف چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔

اس حزنیہ کے ساتھ ہماری اجتماعی زندگی کا دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ جن معاملات میں ہماری قوم کو اظہارِ رائے کی آزادی درکار ہے تاکہ اس کے بہی خواہ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے خطرات کی نشان دہی کر کے اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اُسے تیار کر سکیں ان میں قطعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی۔ برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں یہ تاثر قائم کیا گیا ہے کہ ان کی ہر بات صحیح اور ان کا ہر فعل حق و صداقت پر مبنی ہے، اور جو لوگ ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ملک و ملت کے دشمن ہیں۔ اس قسطائی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کی نظریاتی اساس کو تباہ کرنے

والوں کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ آگیا ہے جسے استعمال کرنے سے وہ اپنے اس مذموم کام کو بلا خوف و خطر سرانجام دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور وہ حربہ یہ ہے کہ یہ تخریب پسند عناصر جھوٹ، دجل و فریب اور اسی قسم کے مختلف حیلوں، بہانوں سے اقتدار کی صفوں میں گھس کر یا اس کی پناہ لے کر سب سے پہلے حکومت کی پشت پناہی حاصل کرتے ہیں۔ اور پھر اس تحفظ سے فائدہ اٹھا کر نظریاتی بنیاد کو بڑے اطمینانِ خاطر کے ساتھ حکومت کے وسائل کی مدد سے برباد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ حکومت کا مزاج جس قدر آمرانہ ہو اُس میں اس عیار طبقے کا دخیل ہونا اتنا ہی سہل اور آسان ہوتا ہے۔ جس ملک میں آزادیٔ رائے ہو اس میں حکومتیں اپنے تعمیری کاموں کے بل بوتے پر عوامی تائید حاصل کرتی ہیں لیکن جہاں حکومت کا نہج آمرانہ ہو اور حکومت فسطائی ہتھکنڈوں کے استعمال سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہو، وہاں جو فرد یا گروہ بھی برسرِ اقتدار طبقے کی مدح سرائی پر آمادہ ہو اس کی پذیرائی کے نہایت اچھے سامان پیدا ہو جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں عادل و منصف اور رعایا کے بہی خواہ حکمران عوام کی فلاح و بہبود کا خیال رکھ کر تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ انہیں اپنی مدح میں قصیدہ سننے کی کبھی خواہش نہ پیدا ہوتی تھی لیکن جو حکمران ظالم اور مستبد اور رعایا کے معاملے میں اپنے فرائض سے غافل ہوتے تھے انہیں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ پیشہ ور قصیدہ خوانوں کو اپنے اردگرد جمع کر کے ان سے قصیدہ خوانی کروائیں تاکہ ضمیر کی خلش کی وجہ سے انہیں جو ذہنی اذیت ہو رہی ہے اس کا وقتی طور پر تدارک کیا جا سکے۔

حکمرانوں کے نام اور ان کے القابات اگرچہ اب بدل گئے ہیں۔ بادشاہوں کی جگہ اب "عوامی قائدین" اور "عوامی رہنماؤں" نے لے لی ہے۔ مگر مزاج میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ عدل و انصاف کے علمبردار اور انسانیت کے حقیقی خیر خواہ قائدین کے لیے یہ بات بذاتِ خود روحانی اور ذہنی سکون کا باعث ہوتی ہے کہ وہ حق و صداقت کی راہ پر گامزن ہیں اس لیے وہ کسی فرد یا گروہ کی ثنا خوانی سے بہکنے نہیں پاتے۔ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے ہیں اسے پورے خلوص کے ساتھ کرتے ہیں۔ خواہ لوگ ان کی مدح سرائی کریں یا انہیں گالیاں دیں۔ انہیں نہ تو پیشہ ور ثنا خوانوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ایسے غیر مخلص حامیوں کی جن کی وفاداریاں دنیوی مفادات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو مطمحِ نظر محض اقتدار ہو اور اس کے حصول اور پھر اس پر طویل مدت تک قابض رہنے کے لیے وہ ہر قسم کے جائز و ناجائز حربے استعمال کرنے کے لیے تیار ہوں انہیں قصیدہ خوانوں اور زندہ باد کے نعرے لگانے والوں

کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی قصیدہ خواں یا نعرہ باز ان کی طرف رجوع کرتا ہے تو یہ لپک کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور وہ نہایت قلیل مدت میں ان کا منظورِ نظر بن کر ان کے مزاج میں دخیل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جو بھی کرے اس پر کوئی گرفت نہیں کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اقتدار کے تحفظ میں آجانے کے بعد وہ نہ صرف احتساب سے محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ اس کے معصوم ہونے پر بھی مہر تصدیق ثبت ہو جاتی ہے اور جو شخص اس کے کسی کام پر اعتراض کرے وہ رجعت پسند، عوامی مفادات کا دشمن اور ملک و ملت کا بدخواہ قرار پاتا ہے اور اسے راستے سے ہٹانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

اسلام کے نامور مجاہد سیّد قطب شہید علیہ الرحمۃ کی

ایمان افروز اور فکر انگیز کتاب

"اَلمُستَقبِل لِھٰذَا الدِّین"

کا اردو ترجمہ

اِسلام کا روشن مستقبل

از

عبدالحمید صدیقی

کتابت بہترین۔ طباعت دیدہ زیب۔ سرورق سہ رنگا خوبصورت۔ کاغذ آفسٹ پیپر۔ قیمت چار روپے۔

اِدارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ، لاہور